

حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کا احسانی و عرفانی مقام

(حصہ دوم)

جناب محمد ظفر اقبال

شیخ الہند: بے نفسی اور عاجزی کا عظیم مظہر:

عجب اور تکبر کے بالمقابل بے نفسی و تواضع ہے۔ اس کی حقیقت زبانی اظہار سے زیادہ عملی ہے۔ یہ خود کو محض پیچ مدال، احقر، خاکسار اور فقیر کہہ دینے سے عبارت نہیں بلکہ اس کی حقیقت خود کو کسی بھی امتیازی وصف کی بنا پر عام لوگوں سے بلند سمجھے جانے کی عملی نفی ہے۔ بلکہ عارفین نے تو یہ بات نہایت وضاحت سے فرمائی ہے کہ جس نے اپنے لیے تواضع کو ثابت کیا وہ بے شبہ متکبر ہے، کیوں کہ تواضع کا دعویٰ تو اپنی رفعت قدر کے مشاہدے کے بعد ہوگا، پھر جب اپنے لیے تواضع کا دعویٰ کیا گیا تو گویا اپنے مرتبے کی بلندی کا مشاہدہ کیا، یہی تکبر ہے۔ بے نفس، متواضع اور عجب سے پاک شخص ہمیشہ عام انسانوں میں گھلا ملا رہتا ہے۔ اس کے انداز و اطوار کا کمانہ نہیں ہوتے اور نہ وہ خوردوں سے کسی بڑائی یا تعظیم کا متمنی ہوتا ہے۔ حضرت شیخ الہندؒ اس وصف میں بھی نمایاں اور ممتاز تھے، مولانا حسین احمد مدنی لکھتے ہیں:

”حضرت شیخ الہندؒ کا طبعی مذاق تھا کہ وہ غرباء اور معمولی آدمیوں میں رہنا پسند فرماتے تھے اور اپنی عادت، لباس، چال، معاملات وغیرہ اس قسم کا رکھنا چاہتے تھے۔ اہل دنیا اور امر اور تکلف والوں سے گھبراتے تھے..... ریل میں تیسرے درجے میں سفر کرنا پسند فرماتے تھے۔“^{۲۵}

وہ بدابہتہ خود کو ہر کمال اور عظمت سے معر بادور کرتے تھے۔ مولانا قاری محمد طیبؒ لکھتے ہیں:

”اس رفعت شان پر بے نفسی کا عالم یہ تھا کہ گویا نفس کا کوئی تقاضا باقی ہی نہیں رہا تھا۔ یا اس کے پورے ہونے کی کوئی صورت نہیں رہ گئی تھی، یا اسے پامال کرنے کی فکر ہر وقت دامن گیر رہتی تھی۔“^{۲۶}

اس سلسلے میں شیخ الہندؒ کی زندگی کے تین واقعات ملاحظہ کیجیے۔ یہ عاجزی و فروتنی آج بھی عوام سے زیادہ

خواص سے اتباع و تقلید کا مطالبہ کر رہی ہے۔ قاری محمد طیبؒ لکھتے ہیں:

”اس زمانے میں اکثر مساجد میں کسیر بچھادی جاتی تھی جو نرم بھی ہوتی تھی اور گرم بھی، یہ گھاس تالابوں میں پیدا ہوتی ہے، جب سوکھ جاتی ہے تو لوگ اسے بچھانے کے لیے لے آتے تھے، اسے دیہات کا قالین یا نرم گدہ سمجھنا چاہیے۔ حضرت شیخ الہندؒ کی مسجد میں بھی سردیوں میں برابر اس کا فرش ہوتا تھا، موسم سرما آنے پر ایک دن خود ہی طلبہ سے فرمایا کہ آؤ بھی مسجد کے لیے کسیر لے آویں، چار طلبہ کے ساتھ ہو لیے، انھیں حضرت اپنے باغ میں لے گئے، وسط باغ میں تالاب بھی تھا اور اس پر کسیر بہ کثرت پیدا ہوتی تھی، چنانچہ کسیر کاٹی گئی، خود حضرت بھی درانتی سے کانٹے میں شریک رہے، کاٹ کر جمع شدہ ذخیرے کے پانچ گٹھر بنائے، طلبانے عرض کیا کہ حضرت پانچ گٹھریاں کیوں بنائی گئی ہیں، ہم تو چار ہیں، فرمایا اور میرا حصہ کہاں گیا؟ یہ کہہ کر چار بڑی بڑی گٹھریاں تو طلبہ کے سروں پر رکھوائیں اور ایک اپنے سر پر رکھی، ہر چند طلبہ بہ ضد ہوئے کہ حضرت اس ذخیرے کی چار گٹھریاں کردی جائیں، ہم کافی ہیں، کچھ زیادہ بوجھ نہیں، مگر حضرت نے نہ مانا، چار گٹھریاں طلبہ کے سروں پر اور ایک اپنے سر پر رکھ کر یہ قافلہ چلا۔ شہر میں آیا اور بازار کے ایک حصے میں سے گذرا، ان طلبہ کو تو ممکن ہے کہ سر پر گھاس رکھ کر بازار میں سے گذرنے پر کچھ عار آ رہا ہو لیکن حضرت کی بے نفسی کا عالم یہ تھا کہ گویا اپنے کو اس بوجھ اٹھانے کا اہل اور مستحق سمجھ کر شہر سے گذر رہے تھے، دیہات والے بھی اب جسے پسند نہیں کرتے موصوف کے یہاں وہ بوجھ ایک معمولی بات تھی۔“

قاری محمد طیبؒ اسی واقعے سے متصل ایک اور واقعہ بھی نقل کرتے ہیں جس میں تواضع، خاکساری، لہیت، شفقت، محبت اور حسن ادا سب ہی اسباق موجود ہیں، قاری صاحب لکھتے ہیں:

”میرے خسر مولوی محمود صاحب رام پوری فرماتے تھے کہ وہ دیوبند میں طالب علمی کے زمانے میں چھوٹی مسجد میں رہا کرتے تھے، جس میں حضرت مفتی اعظم مولانا عزیز الرحمن صاحب کا قیام تھا، اس زمانے میں طلبہ میں چار پائی کا دستور نہ تھا، سادگی اور تواضع سے عموماً طلبہ زمین پر لیٹتے تھے۔ مولوی صاحب باوجود رئیس گھرانے کا ایک فرد ہونے کے عام طلبہ کی طرح فرش زمین پر ہی اپنے حجرے میں لیٹا کرتے تھے۔ حضرت شیخ الہندؒ کا موصوف سے اور رام پور کے اس گھرانے سے بہت گہرا اور مخلصانہ تعلق تھا اور مولوی محمود صاحب مرحوم سے یوں بھی خصوصیت زیادہ تھی، ایک دن حضرت شیخ الہندؒ چھوٹی

مسجد میں تشریف لائے اور مولوی محمود صاحب کے حجرے پر گذر ہوا، یہ زمین پر فرش بچھائے لیٹے تھے، فرمایا محمود! تیرے پاس چار پائی نہیں؟ انھوں نے عرض کیا کہ حضرت چار پائی تو نہیں ہے، مجھے زمین پر لیٹنے کی عادت ہوگئی ہے، اس سے بہت متاثر ہوئے مگر فرمایا کچھ نہیں، اگلے دن دوپہر کا وقت تھا گرمی شدید تھی، لوچل رہی تھی کہ مولوی صاحب نے کھڑکی سے دیکھا، حضرت اپنے کندھے پر ایک چار پائی لیے خود تشریف لا رہے ہیں، وزنی چار پائی ہے مگر اسے سر پر اٹھا رکھا ہے۔ مولوی صاحب صورت حال دیکھتے ہی حجرے سے نکل ننگے سر اور ننگے پیر حضرت کی طرف دوڑے، حضرت انھیں بھاگتا ہوا دیکھ کر وہیں سڑک پر کھڑے ہو گئے اور چار پائی زمین پر رکھ دی، جب قریب پہنچے تو ایک خاص انداز سے فرمایا جناب یہ لے جاؤ اپنی چار پائی مجھ سے نہیں اٹھتی، میں بھی شیخ زادہ ہوں مجھ سے یہ چار پائیاں نہیں گھسیٹی جاتیں۔ یہ فرما کر پیٹھ پھیر لی اور گھر روانہ ہو گئے، مولوی صاحب کچھ کہنے ہی نہ پائے اور چار پائی اٹھا کر حجرے میں لے آئے، گویا انھیں کوئی کلمہ معذرت بھی نہیں کہنے دیا کہ وہ معنی ثناء حسن ہو جاتی،“ ۲۸

شیخ الہند: بہ یک وقت اپنے معمول کی پابندی اور طلبا کی رعایت:

قاری محمد طیب صاحب ہی نقل کرتے ہیں کہ:

”حضرت نانوتوی کی وفات کے بعد حضرت شیخ الہندؒ کی عادت تھی کہ ہر جمعرات کو حضرت گنگوہیؒ کے پاس حاضری کے لیے گنگوہ کا سفر پیدل کرتے تھے، جمعرات کو چھٹی کا گھنٹہ بجتا، اسی وقت سبق سے اٹھ کر گنگوہ کا راستہ لیتے، گنگوہ دیوبند سے ۲۲ کوس یعنی ۳۰ میل ہے، حضرت اذان عصر پر چلتے اور عشا گنگوہ پڑھ لیتے تھے۔ جمعہ کا پورا دن حضرت گنگوہیؒ کی خدمت میں گزار کر اذان عصر کے قریب گنگوہ سے واپس ہوتے اور عشا دیوبند میں پڑھ لیتے تھے۔ برس ہا برس یہ معمول رہا، سردی ہو یا گرمی یہ معمول قضا نہ ہوتا تھا۔

مولوی محمود صاحب کا بیان ہے کہ ایک دن ہم دو تین طلبا نے اصرار کیا کہ حضرت ہم بھی ساتھ چلیں گے، فرمایا اچھا، مگر اس دن حضرت نے ان طلبا کی رعایت سے پیدل سفر کرنے کے بجائے ارادہ کیا کہ سفر سواری پر ہو، تو کمہار کا ایک ٹوکرا یہ پر لے لیا اور ارادہ یہ کیا کہ دو تین طلبا اترتے چڑھتے چلے جائیں گے، چنانچہ کمہار ٹوکرا لے کر دارالعلوم کے دروازے پر آگیا، حضرت حسب معمول اذان عصر

کہ قریب درس سے اٹھے، یہ طلبا بھی حاضر تھے تو حضرت نے فرمایا کہ بھائی میاں محمود پہلے تم سوار ہو پھر باری باری ہم بھی سوار ہوتے رہیں گے، انھوں نے حضرت کے سوار ہونے پر اصرار کیا تو حضرت نے نہ مانا اور زبردستی مولوی محمود صاحب کو سوار کر دیا، دو طلبا اور خود حضرت پیچھے پیچھے پیدل روانہ ہوئے بلکہ ایک چچی لے کر ٹٹو کو ہانکا نا بھی اپنے ذمے لے لیا۔

مولوی محمود صاحب فرماتے تھے کہ میں سخت ضیق میں تھا کہ حضرت تو پیچھے پیچھے پیدل ہیں اور میں سوار ہوں مگر مجبور تھا حکم یہی تھا، دو چار میل چل کر یہ ٹٹو سے اتر گئے تو حضرت نے زبردستی دوسرے طالب علم کو بٹھادیا اور خود ٹٹو ہانکتے جا رہے ہیں، چار پانچ میل کے بعد دوسرے طالب علم کو چڑھا دیا۔ غرض تیس میل کا سفر پورا طے ہو گیا مگر خود نہیں چڑھے باری باری ان طلبا کو بٹھاتے رہے، اس وقت معلوم ہوا کہ یہ ٹٹو اپنے لیے کرائے پر نہیں لیا تھا بلکہ ان طلبہ کے لیے شفتا لیا گیا تھا۔ جمعے کو واپسی ہوئی تو طلبہ گھبرائے کہ اب پھر وہی معاملہ ہوگا کہ ہم ٹٹو پر سوار ہوں گے اور حضرت پیدل چلیں گے، ہاں ہم مشورہ ہوا کہ آخر کیا صورت اختیار کی جائے کہ ہم پیدل چلیں اور حضرت کو ٹٹو پر سوار کر دیں۔

مولوی محمود صاحب فرماتے تھے کہ میں نے کہا ترکیب تو میں کر دوں گا کہ حضرت پورے راستے ٹٹو سے نہ اتر سکیں مگر ایک دفعہ سوار کر دینا ہے۔ چنانچہ جب گنگوہ سے روانگی ہوئی تو حسب معمول طلبا پر زور دیا کہ سوار ہو مگر یہ لوگ ایک ایک کر چکے تھے عرض کیا کہ حضرت آتے ہوئے ہم سوار رہے اب واپسی میں یہ نہیں ہوگا، حضرت سوار ہوں خواہ پھر اتر لیں مگر ابتدا حضرت ہی کے سوار ہونے سے ہوگی۔

جب یہ سب اکٹھے ہو کر بہ ضد ہوئے تو آخر حضرت نے قبول فرمایا اور ٹٹو پر سوار ہو گئے۔ طلبا نے چپکے سے مولوی محمود سے کہا کہ تم اب وہ موعودہ ترکیب کرو کہ حضرت دیوبند تک ٹٹو سے نہ اترنے پائیں، چنانچہ مولوی صاحب نے وہ مؤثر نسخہ استعمال کیا کہ جب حضرت سوار ہو گئے تو انھوں نے ٹٹو کے برابر میں آکر حضرت نانوتویؒ، حضرت حاجی امداد اللہؒ، حضرت حافظ شہیدؒ وغیرہ اکابر کا تذکرہ چھیڑ دیا۔ حضرت کی عادت تھی کہ ان بزرگوں کا ذکر چھڑتے ہی ان میں محو ہو جاتے تھے اور پھر ادھر ادھر کی کچھ خبر نہیں رہتی تھی۔

ان حضرات کا ذکر چھڑتے ہی جو حضرت نے ان بزرگوں کے واقعات بیان کرنے شروع کیے تو حضرت کو نہ راستے کی خبر رہی نہ ان طلبا کی، پورے تیس میل کا سفر طے ہو گیا، ندی آگئی جو دیوبند سے تین چار میل کے فاصلے پر ہے۔ ندی دیکھتے ہی حضرت نے گھبرا کر فرمایا کہ اوہو! ندی آگئی اور یہ کہہ کر

ٹٹو سے کوڈ کر اترے۔ فرمایا بھائی میں نے تم سب کا حق مار لیا لو جلدی سے تم سوار ہو، طلبہ نے ہر چند حضرت کے بیٹھنے کا اصرار کیا مگر حضرت تہیہ فرما چکے تھے کسی کہ نہیں سنی، باری باری ان لوگوں کو بٹھلایا، شہر میں داخل ہوئے تو پھر اسی شان سے کہ طلبا سوار ہیں اور حضرت پیدل ہیں، چچی ہاتھ میں ہے اور ٹٹو ہانک رہے ہیں جس سے طلبا پچنا چاہتے تھے بالآخر وہی چیز پھر سامنے آ کر رہی۔ سبحان اللہ بے نفسی اور شفقت کی انتہا ہے۔^{۲۹}

شیخ الہند: اتباع شیخ کا مثالی نمونہ:

اس مقام پر اگرچہ یہ واقعہ شیخ الہندؒ کے معمول کی پابندی اور طلبا کے حق میں شفقت و رعایت کی غرض سے بیان کیا گیا ہے، لیکن اگر اس سے متصل ایک اور اہم واقعہ بیان نہ کیا جائے تو بات ادھوری رہ جائے گی اور منازل سلوک و احسان میں شیخ کی اتباع کامل کے متعلق شیخ الہندؒ کا اسوہ پوری طرح نکھر کر سامنے نہیں آ سکے گا۔ شیخ الہندؒ کا یہ معمول ذکر کیا جا چکا ہے کہ آپ کا جمعرات کے روز چھ گھنٹے پڑھانے کے بعد دیوبند سے گنگوہ پیدل جانے کا معمول تھا۔ ایک دفعہ:

”شیخ الہندؒ کے دوست نے جو زمانہ طالب علمی سے دوست تھے اور بعد میں سرکاری ملازمت اختیار کر لی تھی، پوچھا کہ محمود! بتا تو دے، گنگوہ میں کیا رکھا ہے جو تو ہر جمعرات کو دوڑا دوڑا جاتا ہے؟ شیخ الہندؒ نے جواب دیا: ظالم تو نے پی ہی نہیں! اب کے تو بھی چل! — وہ ساتھ جانے پر تیار ہو گیا، چناں چہ ساتھ لے گئے، اتفاق سے ان دنوں شاہ عبدالقدوس گنگوہیؒ کے مزار پر عرس ہو رہا تھا۔ حضرت امام ربانی [گنگوہیؒ] کا معمول عرس کے ایام میں ابتداً تو یہ تھا کہ ان دنوں میں گنگوہ چھوڑ دیتے تھے، خانقاہ خالی کر دیا کرتے تھے اور جب معذور ہو گئے تھے تو سفر ترک فرما دیا تھا۔ ہاں! خانقاہ میں نہیں آتے تھے، البتہ نماز کے لیے پانچوں وقت تشریف لاتے، بلکہ نماز خود ہی پڑھایا کرتے تھے۔ اتنا لحاظ عرس والے بھی کرتے تھے کہ اذان کے وقت سے جماعت ختم ہو جانے اور سنتیں وغیرہ پڑھنے تک قوالی بند کر دیا کرتے تھے۔ ان ایام میں حضرت کے یہاں مہمانوں کی آمد و رفت بالکل بند رہتی تھی، کسی سے مصافحہ تک نہیں کرتے تھے — غرض حضرت شیخ الہندؒ رات کے وقت گنگوہ پہنچے اور حضرت کے مکان پر حاضر ہوئے۔ حضرت نے دیکھتے ہی ڈانٹنا شروع کر دیا اور فرمایا، ابھی واپس جاؤ۔ آپ [شیخ الہندؒ] کے ایک اور بھائی اور دوست تھے شاہ مظہر حسین گنگوہیؒ، مولانا فخر الحسن گنگوہیؒ، عبدو داؤد کے بھائی،

انہوں نے عرض کیا، حضرت! یہ عرس میں شرکت کے لیے نہیں آئے، آپ کے پاس آئے ہیں۔ حضرت [گنگوہیؒ] نے ارشاد فرمایا، میں بھی جانتا ہوں عرس میں شرکت کے لیے نہیں آئے، میں اتنا بھولا نہیں ہوں۔ میرے پاس آئے ہیں، مگر آئے تو ہیں اس مجمعے میں ہو کر، ان کے ذریعے اس مجمعے کی رونق تو بڑھی، من کسر سواد قوم فہو منهم [جس نے کسی قوم کے افراد میں اضافہ کیا وہ ان ہی میں سے ہے] وارد ہوا ہے، قیامت کو اپنی برأت کرتے رہیں۔ اس کے بعد شاہ مظہر حسن گنگوہیؒ ان [شیخ الہندؒ] کو اپنے مکان پر لے گئے اور کہا روٹی تو کھا لو، اس پر حضرت شیخ الہندؒ نے آب دیدہ ہو کر فرمایا کہ ”حضرت تو فرما دیں ابھی چلا جا، میں کس منہ سے کھاؤں!“ چنانچہ اسی وقت گنگوہ سے واپس ہو گئے پھر دوسرے وقت عرس ختم ہونے کے بعد حاضر ہوئے۔“ ۳۰

شیخ الہندؒ: استاذ نانوتوی کی خدمت: ۲۲ میل کا پیدل سفر:

جس انسان کا نفس اس درجے حزی اور مظہر ہو چکا ہو، اس کا قلب اپنے محسنین اور اساتذہ، جن سے اسے علم و فضل اور صلاح و تقویٰ بلکہ ایمان میں رسوخ اور عمل میں دوام کی دولت میسر آئی ہو، کی محبت سے کس درجے لبریز ہوگا اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔ یہ محبت ہی انسان کو محبوب کا خادم اور محبوب کو مخدوم بناتی ہے۔ اس خدمت کا صرف ایک نمونہ دیکھیے، ایک مرتبہ مولانا نانوتویؒ کو بخار تھا۔ زمانہ برسات کا تھا اور آنا دیوبند تھا۔ شیخ الہندؒ نے استاذ نانوتویؒ کو گھوڑے پر سوار کیا، ایک ہاتھ سے اس کی لگام پکڑی اور ایک ہاتھ سے رکاب کے قریب ہو کر حضرت کی کر کو سہارا دیا اور اس طرح ۲۲ میل کا راستہ پیدل طے کیا۔ ۳۱

۲۲ میل کا پیدل سفر ————— یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ یہ وہی شخص کر سکتا ہے جس کو استاذ کی محبت نے بے خود کر دیا ہو۔

شیخ الہندؒ: مولانا نانوتویؒ کے والد کی اولاد سے بڑھ کر خدمت:

چلیے حضرت نانوتویؒ تو استاذ تھے، اس طرز کی خدمت کی مثالیں ڈھونڈنے سے دیگر باصفا حضرات کے یہاں بھی مل جائیں گی۔ لیکن ایک واقعہ اس سے زیادہ حیران کر دینے والا ہے جو استاذ نانوتویؒ سے نہیں بلکہ ان کے والد المحترم سے متعلق ہے۔ مولانا قاری طیبؒ لکھتے ہیں:

”حضرت نانوتوی کے والد شیخ اسد علی مرحوم جب مرض وفات میں شدید مبتلا ہوئے تو علاج کے لیے دیوبند لائے گئے، قیام شیخ الہند کے مکان پر ہوا، دستوں کا مرض تھا..... ایک دفعہ دست چار پائی پر خطا

ہو گیا اس وقت حضرت نانوتوی بھی یہاں موجود نہ تھے، حضرت شیخ الہند موجود تھے اور صورت ایسی ہو گئی کہ نجاست اٹھانے کے لیے ظرف بھی نہ تھا۔ حضرت شیخ الہند نے بے تکلف ساری نجاست اپنے ہاتھوں اور ہتھیلیوں میں لے لی اور سمیٹنی شروع کر دی، تمام ہاتھ گندگی میں آلودہ ہی نہ تھے بلکہ ہاتھوں میں نجاست لبریزی کے ساتھ بھری ہوئی تھی۔ حضرت نانوتوی پہنچ گئے اور دیکھا کہ حضرت شیخ الہند کے دونوں ہاتھ نجاست اور مواد سے بھرپور ہیں اور وہ اسے سمیٹ سمیٹ کر بار بار باہر جاتے ہیں اور پھینک پھینک کر آتے ہیں۔ اس پر حضرت نانوتوی بہت متاثر ہوئے اور وہیں کھڑے کھڑے ہاتھ دعا کے لیے اٹھائے اور عرض کیا کہ خداوند! محمود کے ہاتھوں کی لاج رکھ لے اور اس خاص وقت میں جو جو بھی اپنے اس محبوب تلمیذ کے لیے مانگ سکتے تھے ہاتھ اٹھائے ہوئے مانگتے رہے۔“ ۳۲

مولانا نانوتویؒ اور مولانا گنگوہیؒ کی اولادوں سے خادمانہ برتاؤ کے مظاہر:

اس خدمت و محبت اور مولانا نانوتویؒ کے دل سے نکلی ہوئی دعاؤں نے شیخ الہندؒ کی عظمت و رفعت کو ثریا تک پہنچا دیا۔ ————— مولانا نانوتویؒ کے خدا جانے کتنے اور کیسے کیسے ذہین دؤں کی تلامذہ ہوں گے، لیکن آج ان کی اکثریت کا نام تاریخ اور ماضی کے دھند لکوں کی نظر ہو چکا اور شیخ الہندؒ کا نام مولانا نانوتویؒ کے ساتھ ایسے جڑا ہوا ہے جیسے روٹی کا شمس تبریز کے ساتھ ————— یہ استاذ کی محبت ہی کا اثر ہے کہ مولانا نانوتویؒ اور مولانا گنگوہیؒ کے متعلقین سے شیخ الہندؒ خادمانہ برتاؤ فرماتے تھے اور ان کے حقوق ادا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ ————— مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے صاحبزادے حافظ محمد احمد صاحبؒ، جو شیخ الہندؒ کے شاگرد تھے، کے متعلق شیخ الہندؒ نے فرمایا:

”حافظ احمد کا میرے دل میں اتنا احترام ہے کہ اگر وہ پاخانے کی ٹوکری اٹھانے کو بھی مجھ سے کہیں تو میں اس کی قلیل کو اپنی عزت سمجھوں گا۔“ ۳۳

شیخ الہندؒ، حافظ صاحب کے استاذ ہوتے ہوئے بھی ان کے سامنے مؤدب اور نیاز مندانہ بیٹھا کرتے تھے۔ یہ معمول کی بات تھی کہ جب حافظ صاحب شیخ الہندؒ کے مکان پر تشریف لے جاتے اور شیخ الہندؒ صحن مکان میں چار پائی پر بیٹھے ہوتے، دروازے کے سامنے کی سڑک کی لمبی مسافت سے جہاں حافظ صاحب آتے ہوئے شیخ الہندؒ کو نظر پڑ جاتے تو حضرت چار پائی چھوڑ کر کھڑے ہو جاتے تھے اور اس وقت تک کھڑے رہتے تھے جب تک کہ حافظ مکان میں پہنچ کر اپنی جگہ بیٹھ نہ جائیں اور ان کے بٹھانے کی صورت یہ ہوتی تھی کہ حضرت شیخ کرسی منگواتے، اسے اپنے سر ہانے بچھاتے، جب حضرت حافظ صاحب اس پر بیٹھ جاتے تب حضرت چار پائی پر بیٹھ جاتے۔ ۳۴

یہ تو براہ راست مولانا نانوتوی کی اولاد کا معاملہ تھا، اب مولانا نانوتوی کی تیسری نسل یعنی حافظ محمد احمد کے صاحبزادگان مولانا قاری محمد طیب اور مولانا محمد طاہر کے ساتھ رویہ دیکھیے۔ قاری محمد طیب لکھتے ہیں، جب شیخ الہند نے مالٹا سے رہا ہو کر دیوبند و رود فرمایا تو حافظ صاحب نے فرمایا کہ حضرت ان دونوں بچوں [محمد طیب اور محمد طاہر] کو بیعت فرمائیجیے تو ازراہ تفتن فرمایا:

”لوگ مجھے کہتے ہیں کہ یہ بڑا ہوشیار ہے۔ دو بزرگوں [حضرت گنگوہی اور حضرت نانوتوی] کے دو ہی صاحبزادے ہیں [مولانا مسعود احمد گنگوہی اور حافظ احمد صاحب] اس نے دونوں پر پہلے ہی سے قبضہ جما رکھا ہے، اب اگر ان بچوں کو بھی بیعت کر لیا تو کہیں گے کہ دیکھو اس نے آگے کو بھی قبضہ رکھنے کو داغ بیل ڈال دی ہے۔ دو دن کے بعد اچانک خود ہی دارالعلوم تشریف لاکر مجھے اور طاہر مرحوم کو بلایا، ہمارے ذہن میں بھی نہیں رہا تھا کہ ہمیں بیعت بھی ہونا ہے۔ میں نے عرض کیا حضرت کیوں یا فرمایا؟ فرمایا میرید کرنا ہے۔ اس وقت ندامت سی ہوئی کہ اس کے لیے ہمیں خود حاضر ہونا تھا، لیکن یہاں قصہ برعکس ہو رہا ہے۔“ ۳۵

استاذ کی اولاد کی اولاد کے حق اور خدمت کا ایک اور محیر العقول واقعہ دیکھیے جو اپنے تاثر میں اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ جب قاری طیب صاحب کا رشتہ شیخ الہند کے ایما و حکم پر رام پور کے ایک باعزت و دین دار گھرانے میں طے ہوا تو شیخ الہند نے بڑی امنگ اور جوش مسرت سے فرمایا کہ بھائی! یہ رشتہ میں لے کر جاؤں گا۔ چنانچہ یہ پیغام خود ہی لے کر رام پور تشریف لے گئے اور وہاں جا کر فرمایا:

”میں اس وقت حضرت نانوتوی کے گھرانے کے ایک ڈوم اور جام کی حیثیت سے رشتے کا پیامی بن کر آیا ہوں۔“ ۳۶

حواشی

- (۲۵) حسین احمد مدنی، سفرنامہ شیخ الہند، صفحہ ۱۵۹۔..... (۲۶) قاری محمد طیب، ”پچاس مثالی شخصیات“، مشمولہ مجموعہ رسائل حکیم الاسلام [مرتب: محمد عمران قاسمی بگیا نوی]، مردان: مکتبۃ الاحرار، ۲۰۱۱ء، جلد ۷، صفحہ ۴۲۲۔..... (۲۷) ایضاً، صفحات ۴۲۲-۴۲۳۔..... (۲۸) ایضاً، صفحہ ۴۲۳۔..... (۲۹) ایضاً، صفحہ ۴۲۴-۴۲۵۔..... (۳۰) محمود حسن گنگوہی، ملفوظات فقہیہ الامت، جلد ۱، صفحات ۱۰۶-۱۰۷، قسط اول۔..... (۳۱) عزیز الرحمن بجنوری، تذکرہ مشائخ دیوبند، بجنوری، زرین کتب خانہ، ۱۹۵۸ء، صفحہ ۲۰۲۔..... (۳۲) قاری محمد طیب، ”پچاس مثالی شخصیات“، مشمولہ مجموعہ رسائل حکیم الاسلام، جلد ۷، صفحات ۴۲۶-۴۲۷۔..... (۳۵) ایضاً، صفحہ ۴۲۱-۴۲۲۔..... (۳۶) ایضاً، صفحہ ۴۲۶-۴۲۷۔..... (۳۳) ایضاً، صفحہ ۴۳۹۔..... (۳۴) ایضاً، صفحہ ۴۳۹-۴۴۰۔